''بدیسی'' دانشور کی خدمت میں

ایس ایم معین قریشی ☆

پاکستان کے جو شاعر، ادیب اور دانشور اندرونِ ملک تمام تر عزت، شہرت، دولت اور تمغہ جات سمیٹ لینے کے بعد مغربی ملکوں میں جا بستے ہیں، جب کبھی وطن لوٹتے ہیں تو اُن کے مہمان نواز ہم وطن اُن کی راہ میں لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ اُن کے اعزاز میں عشائیے، ظہرانے، عصرانے اور شعری نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ چونکہ بیرون ملک کے ساز گار ماحول، موسم اور معاشی حالات میں اُن کی دانش کا قد و قامت بڑھ جاتا ہے چنانچہ اب اُن پر منکشف ہوتا ہے کہ جس وطن نے انہیں اتنا کچھ دے کر اور ایسا کچھ بنا کر باہر بھیجا تھا اور جس کی زبان کی انہوں نے تمام عمر روزی کھائی اُس میں رہ کر اور اُس کی زبان بول کر انہوں نے سخت نادانی کی۔ پاکستان تو قدامت پسندوں کا ملک ہے اور اردو غاصبوں کی زبان ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر اردو کے کسی شیدائی کا یہ قطعہ سو فی صد صادق آتا ہے۔

کچھ ایسے بھی اہلِ ایماں ہیں
اپنا کعبہ نہ دَیر رکھتے ہیں
روٹیاں کھا رہے ہیں اردو کی
اور اردو سے بیر رکھتے ہیں

ایسے ہی ایک دانشور دو چار سال باہر رہ کر کچھ عرصے قبل پاکستان تشریف لائے تو یہاں کی ادبی فضا میں گویا ہل چل مچ گئی۔ ہر شخص اور ہر ادارہ اُن کی پزیرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ بلاشبہ یہ اُن کا حق تھا کہ ماشاءاللہ اُن کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے اور اردو ادب کے شعبے میں انہیں ''صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی'' سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ہماری ایک سینئر اور محترم شاعرہ نے بھی اُنہیں ایک مقامی کلب میں ظہرانہ دیا جس میں متعدد اہل علم ہستیوں کے ساتھ اس خاکسار کو بھی (غالباً حق ہمسائیگی نبھاتے

☆ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، ڈیفنس، کراچی

ہوئے) مدعو کرلیا گیا تھا۔

اس قسم کی محافل میں کھانے سے زیادہ اہمیت وہاں کی جانے والی گفتگو کی ہوتی ہے اور اُسی کی کشش ہمیں وہاں لے گئی۔ بات چیت کا آغاز خود مہمان خصوصی نے اردو کے موضوع سے کیا۔ فرمانے لگے کہ اردو زبان اس صدی کے آخر تک ختم ہو جائے گی اس لیے کہ مغربی ملکوں میں اس کے بولنے والے جو تارکینِ وطن آباد ہیں اُن کی دوسری نسل میں اردو کا چلن نایاب ہو گیا ہے جبکہ تیسری نسل میں یہ ناپید ہے۔ اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ ابدالآباد تک مزید کسی (نئے) اردو بولنے والے کی تو مغربی ممالک میں ولادت نہیں ہوگی لہٰذا اس وقت جو لوگ وہاں تھوڑی بہت اردو بول رہے ہیں اُن کے انتقالِ پُر ملال کے ساتھ ہی اردو کی بساط بھی لپٹ جائے گی۔ اُن کے نقطۂ نظر کو درست تسلیم کرلیا جائے تو واقعی انہوں نے اردو کے خاتمے کے لیے نوے سال کی جو رعایت دی وہ بہت فراخ دلانہ تھی۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بآسانی فراموش کر گئے کہ اردو تو بنیادی طور پر برصغیر کی زبان ہے۔ اگر یہاں کے حوالے سے ٹھوس شواہد کے ساتھ وہ کوئی نتیجہ اخذ کرتے تو بات بنتی۔

بہر حال، انہوں نے برصغیر کو اپنے سطحی تجزیے سے یکسر محروم نہیں رکھا۔ ارشاد ہوا ''ہم لوگوں نے اردو کو قومی زبان بنا کر دوسری زبانوں پر بڑا ظلم کیا۔ اُس پہ طرہ یہ کہ ہم اردو کو عرش سے فرش پہ نہ لا سکے۔'' ہم نے سوچا اُن سے سوال کریں ''حضور آپ نے یہاں رہتے ہوئے ان ''مظالم'' کے خلاف آواز کیوں نہ اٹھائی؟ آپ تو نہ صرف ان مظالم میں شریک رہے بلکہ ان میں شرکت کے عوض انعامات و اعزازات بھی بٹورتے رہے۔ اردو کے مستند شاعر، ادیب، نقاد اور استاد ہونے کے باوجود آپ نے اسے عرش سے فرش پر لانے کے لیے کیا بے لوث خدمات انجام دیں؟ کیا تحریک چلائی؟ جب اردو کے رزق سے آپ کا شکم مبارک حلق تک بھر گیا تو آپ کے نزدیک اس کے تمام فیوض و برکات اچانک عیوب و خرافات میں بدل گئے۔'' لیکن

ع ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ ترا۔

موصوف نے کھل کر تو نہیں کہا لیکن یہ واضح تاثر دیا کہ اردو سامراجی مزاج کی حامل زبان ہے جس نے پاکستان پہنچ کر (اُن کی مراد دراصل اردو خواں طبقے سے تھی جس میں وہ خود بھی شامل ہیں) یہاں کی مقامی زبانوں کو پنپنے کا موقع نہیں دیا اور اردو کو اُن کے سایے سے بچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو سے زیادہ عوامی اور متواضع زبان شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہو کہ اس کا اپنا نام بھی ایک غیر ملکی زبان (ترکی) سے مستعار ہے جس کے معنی ہیں فوج۔ یہ دنیا کی بہت سی زبانوں کے حسین امتزاج سے تشکیل پائی ہے جس کی ایک مثال اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر ہے۔

سائنس سے زیادہ ہے مذہب کی جڑ بڑی
توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی

مندرجہ بالا شعر کا لسانی تجزیے کرتے ہیں تو یہ صورت حال سامنے آتی ہے:

☆ سائنس.....انگریزی ☆ سے.....ہندی

☆ زیادہ.....عربی ☆ ہے.....ہندی

☆ مذہب.....عربی	☆ کی.....ہندی
☆ جڑ.....ہندی	☆ بڑی.....ہندی
☆ توپوں (توپ کی جمع).....ترکی	☆ کی.....ہندی
☆ مار.....ہندی	☆ سے.....ہندی
☆ بھی.....ہندی	☆ خدا.....فارسی
☆ کی.....ہندی	☆ پکڑ.....ہندی
☆ بڑی.....ہندی	

دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کی طرح اردو بھی ہنوز ''زیرِ تشکیل'' ہے۔ پاکستان کی حد تک آج کی اردو وہ نہیں جو قیامِ پاکستان کے وقت تھی۔ آج اس میں پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں (جنہیں اب صوبائی یا علاقائی کے بجائے ''پاکستانی زبانیں'' کہا جاتا ہے) کے الفاظ مل جاتے ہیں۔ یہ رجحان نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اب تو غزل بھی غیر اردو الفاظ اپنے اندر سمونے لگی ہے۔ ریحانہ روحی نے ''اوزار'' کو اپنی غزل میں جگہ دی۔ کہتی ہیں ؎

روحی حریف تم سے اوزار ہیں تو کیا
تم نے بھی جان اُن کی مصیبت میں ڈالی ہے

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اردو کا دامن وسیع تر ہو رہا ہے۔ دوسری زبانوں سے اشتراکِ عمل کو الگ رکھیے، خود اردو کے الفاظ نئے نئے جامے پہن رہے ہیں۔ کیا چمچہ، لوٹا، لفافہ، کھانچا، جیالا اور متوالا آج صرف اُن ہی معانی میں مستعمل ہیں جو فرہنگ آصفیہ میں درج ہیں؟ کیا ''سونے پہ سہاگہ'' کا محاورہ اب اُلٹا مفہوم نہیں دے رہا ہے؟ کیا ''عوام'' کی جنس (بغیر آپریشن) تبدیل کر کے اسے مونث نہیں بنایا جا رہا؟ یہی نہیں بلکہ اسے جمع کے صیغے سے نکال کر واحد کے صیغے میں ڈال دیا گیا ہے۔ پھر اردو کہاں عرش پر رہی؟ کبھی کی ''اردوئے معلّٰی'' ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ''اردو محلّہ'' میں تبدیل ہو چکی ہے

ع پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفا دار نہیں!

اعداد و شمار کی رُو سے ایک زمانے میں دنیا کے لوگ ۱۵ ہزار زبانیں بولتے تھے جو اب گھٹ کر ۶ ہزار رہ گئی ہیں۔ ماہرین کے مطابق اس صدی کے اختتام تک ان میں آدھی معدوم ہو جائیں گی کیونکہ وہ اب بچوں کو پڑھائی نہیں جا رہی ہیں۔ ۲۱۰۰ء تک وہی زبان بچے گی جسے (۱) بچے پڑھ رہے ہوں گے، (۲) حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گی اور/ یا (۳) لاکھوں لوگ بول رہے ہوں گے۔ اس وقت دنیا میں گیارہ زبانیں ایسی ہیں جنہیں دس کروڑ سے زیادہ لوگ بولتے ہیں۔ الحمدللہ، پاکستان کے کم سے کم ۱۰ کروڑ عوام اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اگر بھارت میں ہندی کے نام سے اردو بولنے والی آبادی کو اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ۴۰ کروڑ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے۔ بھارت میں ''اردو'' اب دیوناگری میں بھی لکھی جا رہی ہے۔ اگر رسم الخط کو معیار بنایا جائے تو اردو دنیا کی ۱۹ ویں بڑی زبان قرار پاتی ہے۔ ''یونیسکو'' کی جانب سے ۱۷ فروری ۲۰۰۹ء کو جاری

کیے گئے ایک لسانی جائزے میں کہا گیا کہ اس وقت دنیا کی ڈھائی ہزار زبانیں معدومیت کے خطرے سے دوچار ہیں۔ان میں پاکستان کی بھی ۲۷ زبانیں شامل ہیں لیکن اردو تو دور کی بات ہے سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، سرائیکی اور ہندکو بھی محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر محمد شریف نظامی (ریسرچ ایڈوائزر، مسقط یونیورسٹی) نے اپنے مقالے ''اردو ذریعہ تعلیم'' (مطبوعہ ''معارف مجلّہ تحقیق''، ادارہ معارف اسلامی، کراچی، مطبوعہ جولائی۔دسمبر ۲۰۱۳ء) میں لکھا کہ جب کسی زبان میں انسائکلو پیڈیا طبع ہونے لگیں تو اسے ایک بین الاقوامی سطح کی زبان گردانا جاتا ہے۔اس وقت ۲۸ سے زیادہ اردو انسائیکلو پیڈیا موجود ہیں جن میں سے کئی ایک کی ضخامت ۱۰ سے ۲۳ جلدوں تک ہے جبکہ اردو کی لگ بھگ سات سو لغات بازار میں آچکی ہیں۔

ایسی عظیم زبان کے بارے میں یہ بدگمانی پھیلانا کہ وہ اگلے نوے سالوں میں ختم ہو جائے گی اگر *WISHFUL THINKING* (آرزومندانہ سوچ) نہیں تو انتہا درجے کی معصومیت ضرور ہے۔اردو بنگلہ دیش، نیپال، ماریشس، مشرقی وسطیٰ حتیٰ کہ افریقہ کے بعض ملکوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔چند سال قبل اپنے ترکی کے دورے میں ہم استنبول یونیورسٹی گئے۔یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہاں ''شعبہ اردو'' بھی قائم ہے جس میں ڈیڑھ سو طلبا زیر تعلیم تھے۔شعبے کے پروفیسر (ڈاکٹر) دُرمش بُلگُر (*DURMUS BULGUR*) صاحب نے بتایا کہ انقرہ یونیورسٹی میں بھی یہ شعبہ کام کر رہا ہے۔ان کے شعبے میں دو طالب علم اردو میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔خود ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی (ملتان) کے پروفیسر (ڈاکٹر) اے بی اشرف کی زیرنگرانی مکمل کیا تھا۔اردو کے حق میں مستشرقین نے تو بہت کچھ کہا اور لکھا لیکن غیروں کی دو گواہیاں، جن کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے، بے محل نہ ہوں گی:

آنجہانی آنند نرائن ملّا (شاعر، جج، مترجم):

گو لاکھ ہو رنگت پھولوں میں خوشبو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں
اس ملک میں چاہے بُہن برسے اردو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں

پنڈت گلزار دہلوی (نامور شاعر اور اردو کے زبردست خیرخواہ):

انعامِ خسروی و نظامی ہے یہ زباں
اردو میں گالیاں بھی ملیں تو قبول ہے

اردو کے بارے میں ہوائیاں چھوڑنے کے بعد کراچی کلب کے یخ بستہ ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے پاکستان کے ''بدیسی'' دانشور نے گفتگو کا رخ اچانک سیاست کی طرف موڑ دیا۔ارشاد ہوا ''مہاتما گاندھی بیسویں صدی کے عظیم رہنما تھے.....'' ہم جو بہت دیر سے چپ سادھے بیٹھے تھے یہ سن کر اس کیفیت میں آگئے کہ بقول شاعر ع خامشی باعثِ الزام ہوئی جاتی ہے۔لہٰذا ہم یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ بیسویں صدی کے عظیم رہنما نیلسن منڈیلا تھے جنہوں نے اپنے وطن (جنوبی افریقہ) کی آزادی

کی خاطر ۲۷ سال جیل میں گزارے۔ یہ جیل ایسا نہیں تھا جہاں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے ہمارے سیاست داں اپنے لیے ''وی آئی پی'' کلاس کا مطالبہ کرتے ہیں (جو بالآخر انہیں مل جاتی ہے)۔ منڈیلا نے اپنی قید تنہائی کا نقشہ اپنی کتاب *Long Walk to Freedom* میں ان دلخراش الفاظ میں کھینچا ہے ''میری تنگ کوٹھڑی میں قدرتی روشنی کا کوئی گزر نہ تھا۔ ایک چھوٹا بلب ۲۴ گھنٹے جلتا تھا۔ چونکہ مجھے گھڑی رکھنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے میں اکثر گمان کرتا کہ آدھی رات ہو چلی ہے جبکہ وہ سہ پہر کا وقت ہوتا تھا۔ تنہائی اتنی ہولناک تھی کہ اگر کبھی میری کال کوٹھڑی میں کوئی لال بیگ آجاتا تو میں اسی سے باتیں کرنے لگ جاتا تھا۔''

اس پر موصوف نے خود اپنی تصحیح کی ''میں دراصل برصغیر پاک و ہند کے تناظر میں اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔'' ہم نے عرض کیا ''اگر یہ بات ہے تو قائداعظم بلاشبہ اس خطے میں بیسویں صدی کے عظیم رہنما تھے جن کی عظمت کو تمام عالم نے تسلیم کیا ہے۔'' قائداعظم کی زندگی میں ہمیں شرافت، متانت، دیانت، ذہانت، محنت، استقامت، خلوص، خودداری، راست بازی، معاملہ فہمی، دور اندیشی، بے لوثی، بے ریائی اور اصول پسندی کے اعلیٰ اور ناقابل تقلید نمونے ملتے ہیں۔ ان کے ذاتی کردار پر ان کے سخت سے سخت مخالف بھی انگلی نہ اٹھا سکے۔ وہ بیرونی طور پر جتنے نحیف اور کمزور تھے اندرونی طور پر اتنے ہی قوی اور اولوالعزم تھے۔ وہ ایک جامع کمالات شخصیت تھے اور علامہ اقبالؔ کے اس شعر کی تجسیم تھے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ہمارے ''بدیسی'' ممدوح کے علاوہ بہت سے ''روشن خیال'' دانشور اور ''معروضی تجزیہ کار'' مندرجہ بالا بیان کو جذباتیت سے تعبیر کریں گے۔ انہوں نے اپنی خود ساختہ دانش کی سطح کو اس درجہ بلند کرلیا ہے کہ وہ بابائے قوم کو ''قائداعظم'' کہنا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ اکثر جناح صاحب، مسٹر جناح یا صرف جناح کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ قائداعظم خطابات والقابات سے بے نیاز اور بالاتر تھے۔ جو دلوں پر راج کرے، اسے بھلا کسی دنیاوی خطاب کی کیا ضرورت؟ ہم اپنے قارئین اور خاص طور پر ادھ کچے دانشور طبقے کی اطلاع کی غرض سے لکھ رہے ہیں کہ قائداعظم کو گاندھی جی نے بھی قائداعظم مانا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب *India Wins Freedom* کے صفحہ ۸۲ پر رقم طراز ہیں ''میں یہ بتا تا چلوں کہ وہ گاندھی ہی تھے جنہوں نے (محمد علی جناح کے لیے) ''قائداعظم'' یا عظیم رہنما کے خطاب کو سب سے پہلے رواج دیا.....'' (اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔) ایک خط میں گاندھی نے قائداعظم سے دریافت کیا کہ وہ انہیں مسٹر جناح کہہ کر مخاطب کریں یا قائداعظم؟ جواب میں قائداعظم نے انہیں شیکسپئر کا یہ مشہور قول لکھ بھیجا کہ گلاب کو کسی بھی دوسرے نام سے پکارو، وہ ویسی ہی فرحت بخش خوشبو دے گا۔

قائداعظم وہ عظیم شخصیت تھے جن پر ایک اندازے کے مطابق ایک سو کتابیں انگریزی میں اور ان سے زیادہ اردو میں لکھی گئیں۔ ان میں تحقیقی بھی ہیں، تدریسی بھی اور سوانحی بھی۔ البتہ امریکی اسکالر *William Stafford* کا مقالہ: *"The Political Career of Muhammad Ali Jinnah"* خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مطابق قائداعظم کانگریس، مسلم لیگ، ہوم رول لیگ اور امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے عالمی طور پر مسلمہ عظیم رہنما تھے۔ مقالے میں گاندھی، موتی لال نہرو، مدن

موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے جیسے ہندو رہنماؤں کی متعصبانہ سوچ کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

قائداعظم کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو لیجیے، وہ اپنی صف میں ممتاز نظر آئیں گے۔ بحیثیت قانون داں انہیں جو مرتبہ حاصل ہوا دوسرے اس کی تمنا ہی کر سکتے تھے۔ بطور پارلیمنٹیرین وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ایک سیاسی مدبر کے روپ میں انہوں نے دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ مجاہد آزادی کے کردار میں انہوں نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ جس پائے کے رہنما تھے تاریخ عالم میں اس کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔ معروف ماہر تعلیم اور قائداعظم اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر شریف المجاہد اپنی کتاب ''قائداعظم۔ حیات و خدمات'' میں لکھتے ہیں، ''وہ (جارج) واشنگٹن، بسمارک (*Bismarck*)، گیریبالڈی (*Garibaldi*)، لینن، اتاترک اور مسارک (*Masaryk*) جیسے عصرِ جدید کے عظیم رجال عالم کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ لیکن جو بات قائداعظم کو ان سب سے ممتاز اور ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے ان عظیم رہنماؤں نے روایتی طور پر مسلمہ اور متعینہ اقوام کی قیادت کر کے انہیں آزادی سے ہمکنار کیا۔ مگر قائداعظم نے ایک منتشر اور پسماندہ اقلیت کی شیرازہ بندی کر کے اسے نہ صرف اپنی علیحدہ قومیت کا احساس دلایا بلکہ ایک قوم کے قالب میں ڈھالا۔''

پاکستان کا قیام قائداعظم کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ اور برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ان کا حسین ترین تحفہ تھا۔ ایسا معجزانہ کام ایک کرشماتی شخصیت ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ اسی لیے ''لنڈن ٹائمز'' نے اُن کے انتقال پر لکھا تھا ''وہ ان لوگوں کے لیے، اس قوم کے لیے جو اُن کی رہنمائی میں یہاں تک آئی تھی، قائداعظم سے بڑھ کر سربراہِ مملکت سے بھی زیادہ سربلند اور اس اسلامی مملکت کے، جس کی بنیاد خود انہوں نے رکھی تھی معمار سے کچھ زیادہ ہی حیثیت رکھتے تھے۔''

قائداعظم کی تعریف تو ان لوگوں نے بھی کی جو اُن کے سیاسی نظریات کے مخالف تھے۔ *Verdict of India* کے مصنف بیورلی نکلس نے انہیں ''ایشیا کا ایک انتہائی اہم شخص'' قرار دیا اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے جو ۱۹۴۸ء میں مغربی بنگال کے گورنر تھے ان کے بارے میں کہا ''وہ اس صدی کے سب سے ممتاز فرد تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔'' اسٹینلے ولپرٹ (*STAINLEY WOLPERT*) نے اپنی کتاب *Jinnah of Pakistan* میں انہیں اِن یادگار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ''چند ہی لوگ معنی خیز طور پر تاریخ کا رخ موڑتے ہیں۔ ان سے کہیں کم، دنیا کا نقشہ تبدیل کرتے ہیں اور یہ تو شاید ہی کسی نے کیا ہو کہ ایک قومی ریاست تشکیل دی ہو۔ محمد علی جناح نے یہ تینوں کام کیے۔'' اور اب جسونت سنگھ نے اپنی کتاب (*Jinnah : India, Partition, Independence*) میں انہیں گاندھی، نہرو اور پٹیل سے بڑا رہنما تسلیم کیا ہے۔

آیئے اب ایک نظر ''بدیسی'' دانشور کے ہیرو گاندھی جی کی زندگی پر ڈالتے ہیں۔ لندن سے شایع ہونے والی ایک حالیہ کتاب (*Gandhi_Naked Ambition*) کے مصنف *JAD Adams* کے نزدیک گاندھی نفسیاتی جنون کا شکار تھے۔ انہوں نے عام ہندوستانیوں کو یہ غیر فطری اور بیہودہ مشورہ دیا کہ وہ شادی نہ کریں اور اگر کریں تو جنسی تعلقات سے دور رہیں جبکہ خود جوان لڑکیوں کے ساتھ سونے اور نہانے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ البتہ نہاتے وقت ''مہاتما'' (بقول خود) اس امر کا اہتمام ضرور کر لیتے تھے کہ آنکھیں بند رہیں۔ ان کے آشرم میں جو درجنوں عورتیں تھیں انہیں اپنے شوہروں کے ساتھ سونے کی اجازت نہیں

تھی جبکہ مہاشے جی انہیں بلا تکلف اپنے پہلو میں سلا لیتے تھے۔ ذاتی زندگی سے قطع نظر، گاندھی ایک کٹر متعصب ہندو تھے۔

جسونت سنگھ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ لندن کی گول میز کانفرنس کے دوران ایک بار سر آغا خان نے گاندھی سے پوچھا کہ آپ ہندوستان کے باپو کہلاتے ہیں۔ کیا آپ مسلمانوں کے باپو بھی بن سکتے ہیں؟ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے رسالے میں ایک مرتبہ گاندھی نے لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے نمٹنے کے دو طریقے ہیں۔ اول ان کو واپس ہندو دھرم میں لایا جائے۔ دوم، جو اس کے لیے تیار نہ ہوں انہیں ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ افسوس، ہمارے مسلمان دانشور ایسے تنگ نظر شخص کو ''صدی کا عظیم رہنما'' گردانتے ہیں۔ گاندھی اور قائداعظم کے تعلق سے سابق وزیر ہند سر پیتھک لارنس کی رائے قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قائداعظم کی وفات کے موقع پر انہوں نے کہا ''گاندھی ایک قاتل کے ہاتھوں مارا گیا لیکن جناح نے پاکستان سے گہری وابستگی اور لگاؤ میں جان دی۔''

ہمارے یہاں ''دانشوری'' کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کی مدحت اور مسلمانوں کی مذمت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دانشور اپنی تحریر و تقریر سے یہ کھلا تاثر دیتے ہیں کہ وہ مسلمان ہونے پر معذرت خواہ ہیں۔ وہ مسلم جرنیلوں کی فتوحات اور ان کے نتیجے میں اسلام کی ترویج و اشاعت کو جارحیت قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اسی ''جارحیت'' کے نتیجے میں ان کے آباؤ اجداد ایمان کی جس دولت سے سرفراز ہوئے تھے، وہی انہیں میراث میں ملی۔ کراچی کلب میں کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہمارے بدیسی دانشور نے بھی یہی کچھ کیا۔ انہوں نے محمد بن قاسم کو بزعم خود جارح اور عورت باز (*Womaniser*) ثابت کرنے کے بعد کسی قدر سوز خوانی کے انداز میں کہا ''ہندوؤں نے کبھی کسی ملک پر حملہ نہیں کیا۔'' ان کا یہ موقف حقائق کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔ ہم ثبوت کے طور پر اپنے ہندو ہمسائے کے توسیع پسندانہ طرز عمل کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

کشمیر: قانون آزادی ہند کی دفعہ نمبر ۷ کی رُو سے ریاستوں کی تقسیم ان کے جغرافیائی محلِ وقوع، عوام کی مرضی اور آبادی کے مذہبی تناسب کو مدنظر رکھ کر ہونی تھی۔ کشمیر کے ضمن میں یہ تینوں باتیں پاکستان کے حق میں جاتی تھیں لیکن راجہ ہری سنگھ نے مسلم اکثریت کو ختم کرنے کی غرض سے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اس پر کشمیری مجاہدین نے ۱۹۴۸ء میں بزورِ شمشیر ریاست کے ایک تہائی حصے پر قبضہ کر کے وہاں آزاد حکومت قائم کر دی۔ راجہ بھاگ کر دہلی چلا گیا اور کشمیر کو انڈین یونین میں شامل کرنے کی درخواست کی۔ بھارت نے فوراً سری نگر میں اپنی فوجیں اتار دیں۔

اس وقت جب مجاہدین سری نگر سے چند میل دور تھے بھارت تنازع کو اقوام متحدہ میں لے گیا جس کی مداخلت پر جنگ بندی ہوئی اور قرارداد منظور ہوئی کہ اقوام متحدہ کی زیر نگرانی استصواب رائے کا انتظام ہوگا۔ بھارت اس قرارداد پر عمل درآمد کی راہ میں آج تک مزاحم ہے۔ بالآخر ۱۹۸۸ء میں مجاہدین نے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا جس میں اب تک ایک لاکھ مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ تقریباً ۵۰ ہزار معذور ہیں جبکہ ۳ لاکھ کے لگ بھگ جیلوں میں ہیں۔ بھارت کے سات لاکھ فوجی کشمیریوں پر ہر طرح کا ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ ۲۰ ہزار خواتین کی آبروریزی کی جا چکی ہے۔ حقوق انسانی کی عالمی تنظیموں نے بار ہا ان زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کی لیکن وہ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ہمارے دانشور اس حقیقت سے ناآشنا (یا بے حس) ہیں کہ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کے

مطابق کشمیر روئے زمین پر سب سے زیادہ ''گنجان آباد'' فوجی خطہ ہے۔

جوناگڑھ: یہ ایک مسلم ریاست تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں اس کے نواب مہابت خان جی نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کر دیا لیکن نومبر ۱۹۴۷ء میں بھارت نے اس پر قبضہ کر لیا۔ نواب اور ان کا خاندان کراچی چلا آیا۔ جوناگڑھ اب بھارت کا حصہ ہے۔

حیدرآباد دکن: ہمارے مذکورہ دانشور کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے جو جنوبی بھارت میں ایک خود مختار ریاست تھی۔ ہمیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہندوؤں سے اظہار یکجہتی کرتے اور انہیں بھولا بھالا اور امن پسند ثابت کرتے وقت انہیں اپنی ہی اس سابق ریاست کا خیال نہ آیا کہ کس طرح بھارت اسے ہڑپ کر چکا ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان کو امید تھی کہ انگریز حیدرآباد کی سلطنت انگلشیہ سے وفاداری کے پیش نظر کوئی ایسی صورت نکالیں گے جس سے ریاست کی خود مختاری برقرار رہے گی لیکن انگریزوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ آخر کار ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے انتقال کے دو چار روز بعد ہی ایک ایسے وقت میں جب پاکستانی قوم غم سے نڈھال تھی، بھارت کے عیار وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے موقع غنیمت جانتے ہوئے حیدرآباد میں پولیس کی بھاری تعداد بھیج دی۔ اگرچہ اس عمل کو ''پولیس ایکشن'' کا نام دیا گیا لیکن پولیس کو ہندوستانی فوج کی مدد بھی حاصل تھی چنانچہ حیدرآباد پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ سینکڑوں مسلمان حملہ آور پولیس اور فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں صوبہ آندھرا پردیش کی تشکیل ہوئی تو ریاست کو اس نئے صوبے میں شامل کر لیا گیا۔ ہمارے دانشور کو اپنے ہم وطن ''مجاہد دکن'' سید قاسم رضوی بھی یاد نہ آئے جو اس رضا کار تحریک کے سربراہ تھے جس نے بھارت کے حیدرآباد پر حملے کے وقت جنگ کا سارا بوجھ اٹھایا تھا اور جنہوں نے سب سے زیادہ نقصان بھی اٹھایا۔ ظاہر ہے، رضا کار ایک منظم اور مسلح فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور شکست سے دوچار ہوئے۔ بعد ازاں ہندوستان کی حکومت نے سید قاسم رضوی پر مقدمہ چلایا۔ وہ مختلف الزامات کے تحت سزا بھگتنے کے بعد پاکستان آ گئے اور ۱۹۶۴ء میں کراچی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مشرقی پاکستان: بنگلہ دیش جو آج جنوبی ایشیا کا ایک آزاد ملک ہے دسمبر ۱۹۷۱ء تک پاکستان کا حصہ اور سب سے بڑا صوبہ تھا۔ چونکہ اس میں اور مغربی پاکستان میں تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل تھا اس لیے بھارت (جس نے آج تک برصغیر کی جغرافیائی تقسیم کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے) شروع ہی سے یہاں سازشوں کا جال بچھاتا رہا۔ نتیجۃً مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے اور ان میں غلط فہمیاں بڑھتی رہیں جس کی وجہ سے ملک کے مشرقی بازو میں علیحدگی کے جذبات پروان چڑھے۔ ۱۹۷۰ء میں جنرل یحییٰ خان نے الیکشن کرائے جن میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے دو سیٹوں کے علاوہ (جو از خود چھوڑ دی گئی تھیں) تمام نشستیں جیت لیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے مشہور زمانہ ''چھ نکات'' کی بنیاد پر الیکشن جیتا تھا جن کا مقصد پاکستان کو عملاً فیڈریشن سے کنفیڈریشن میں تبدیل کرنا تھا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو باغیانہ سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ وہ قبل ازیں ''اگرتلہ سازش'' کیس میں بھی گرفتار ہوئے تھے۔ لیکن پاکستان کے سیاسی رہنماؤں (خصوصاً اصغر خان) کے مطالبے پر رہا کر دیے گئے حالانکہ بعد میں ثابت ہوا کہ ''اگرتلہ سازش'' کیس بالکل درست تھا۔ شیخ مجیب کی دوبارہ گرفتاری پر مشرقی پاکستان میں ہنگامے

شروع ہو گئے جنہیں بھارت کے تعاون سے بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے خوب ہوا دی۔ مرکزی حکومت کو باغی عناصر کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔ علیٰحدگی پسند عناصر کو بھارت نے اپنے ہاں پناہ دی۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ پاکستانی افواج کی رسد کے تمام ذرائع کٹ چکے تھے اس لیے ۱۶ دسمبر کو انہوں نے بھارتی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور یوں بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا۔ اندرا گاندھی (وزیر اعظم بھارت) نے اس موقع پر کہا ''ہم نے آج دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا۔'' ان کا یہ دعویٰ (جس کا اعادہ پاکستان کا مذہب بیزار طبقہ بھی کرتا ہے) اس وقت درست تسلیم کیا جاتا جب بنگلہ دیش ہندوستان میں ضم ہو جاتا۔ وہ تو ایک آزاد اسلامی مملکت ہے۔ بہر حال اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو ان کے پتا جی (پنڈت نہرو) کشمیر، جونا گڑھ اور حیدر آباد کے ساتھ کر چکے تھے۔ آج اندرا گاندھی کا پوتا (ارون گاندھی) ببانگ دہل کہتا ہے کہ بنگلہ دیش ہم نے بنوایا ہے جبکہ ہمارے ''بدیسی دانشور'' ہندوؤں کو گنگا نہلا رہے تھے۔

پڑوسیوں سے تعلقات: خطے میں اپنی چوہدراہٹ کے قیام کی خواہش نے بھارت کو جنوبی ایشیا میں ایک نفرت کی علامت بنا دیا ہے۔ بھوٹان تو اس کی طفیلی ریاست ہے ہی، نیپال، سری لنکا اور چین بھی اس سے خار کھاتے ہیں۔ ہم نے نیپال اور سری لنکا میں خود دیکھا کہ کوئی بھارت کے لیے کلمہ خیر کہنے کو تیار نہیں۔ سری لنکا میں تامل باغیوں کو اپنی ۳۷ سالہ شورش کے دوران (جس کا حال ہی میں خاتمہ ہوا ہے اور جس میں باغیوں، سری لنکن فوج اور شہریوں کا زبردست جانی نقصان ہوا) بھارت کی سیاسی، اخلاقی اور فوجی مدد حاصل رہی جبکہ چین کی اس سے ۱۹۶۲ء میں باقاعدہ جنگ ہو چکی ہے۔

اب کوئی ہمارے ''بدیسی'' دانشور سے پوچھے کہ اگر ہندو اتنے ہی نردوش ہیں تو کیا: (۱) کشمیر میں عیسائی افواج گزشتہ ۶۳ سال سے مجاہدین کے ساتھ برسر پیکار ہیں؟ (۲) جونا گڑھ پر سکھوں نے قبضہ کر رکھا ہے؟ (۳) حیدر آباد پر جین مذہب کے لوگ قابض ہیں؟ (۴) بنگلہ دیش میں بدھوں کی فوجیں اتری تھیں (۵) تامل باغیوں کو پارسی اسلحہ فراہم کرتے تھے؟ ہمارا یہ مضمون غیر ارادی طور پر طویل ہو گیا۔ دل و دماغ میں اب بھی جو کچھ ہے اس پر غالبؔ کا یہ مصرع صادق آتا ہے ع کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے لیکن ہم اپنے تمام ''برانڈڈ دانشوروں'' کی خدمت میں اس التجا کے ساتھ اس تحریر کا اختتام کرتے ہیں کہ ؎

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے
کیوں برے بنتے ہو ناحق تم کسی کے واسطے

(ریاضؔ خیر آبادی)

❁❁❁